بسم اللہ الرحمن الرحیم

انما الٰہکم الٰہ واحد

بزمِ یوسفی کا پہلا منظر

یعنی

جلوۂ توحید

جسمیں

مبحث ضروریہ توحید پر عقلی اور نقلی بحث کی گئی ہے

من تالیفات

جناب مولانا مولوی حکیم سید ذاکر حسین صاحب اختر (مترجم نہج البلاغہ)

حسب الحکم مصنف ممدوح

ابو القلم سید منیر حسن منیر زیدی الواسطی دہلوی

نے صفر المظفر ۱۳۴۱ھ مطابق اکتوبر ۱۹۲۲ء میں اپنے

مطبع یوسفی دہلی میں طبع کرایا

انتساب

اظہار عقیدت اہل قلم کے لئے ایک ضروری چیز سمجھا جاتا ہے۔ اسی شیوہ قدیم کے موافق میں نے بھی چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں مگر دل پکار اٹھا کہ جس درگاہ سے تجھے ہر قسم کا رزق حاصل ہو رہا ہے کیا اس طرف جھکنا واجب نہیں پس بفتوائے قلب میں ہر طرف سے نگاہ ہٹا کر مظہر ربوبیت حقیقیہ۔ حامل لوائے ولایت مطلقہ حضرت ابو الوقت۔ مربی الارواح حجۃ العصر۔ مالک سالک ولی دوران۔ امام الزمان کی بارگاہ عرش پناہ میں اپنی قلمی کوششیں بطور نذر حقیر پیش کرتا ہوں اور ساتھ ہی چراغ دودمان اویسیہ رئیس ابن الرئیس امیر ابن الامیر عالیجناب نواب **یوسف علی خان** بہادر الملقب بہ سالار جنگ کے لئے اسی درگاہ میں دست بدعا ہوتا ہوں جن کی توجہ اور تحریک سے میں ان رسائل کے لئے قلم اٹھا سکا۔

ذاکر حسین

جلوۂ توحید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ان فی خلق السموات والارض واختلاف اللیل والنہار و الفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس وما انزل اللہ من السماء ماءً فاحیا بہ الارض بعد موتہا وبث فیہا من کل دابۃ و تصریف الریاح والسحاب المسخر بین السماء والارض لآیات لقوم یعقلون۔

انسانی فطرت کا یہ خاصہ ہے کہ اثر کو دیکھتے ہی موثر کی شان نگاہوں میں پھر جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی بات ہے کہ ایک بچے کا ذہن بھی اس کی صداقت پر شہادت دینے کے لئے تیار رہو گا اور فطرت کا یہی وہ پہلا سبق ہے جس پر ہمارے بہت سے بلکہ بیشمار امور کی بنیاد قائم ہے۔

ایک تعمیر معمار کی خبر دیتی ہے۔ تحریر کاتب کی شان ظاہر کرتی ہے۔ نقشِ قدم ظاہر کرتے ہیں کہ "ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے" تصویر سے مصور کے وجود کا پتہ ملتا ہے۔ نقش و نگار رہتی نقاش کی خبر دیتے ہیں۔ یہ سب کچھ صحیح ہے۔ لیکن افسوس کہ انسان ایسے صحیح اصول کو خالق کل کے مقابلہ میں ترک کرتا ہے۔ اور نہیں سمجھتا کہ اس ترک سے عقل انسانی کی تضحیک و تذلیل اس درجے پر

ہو گئی جس سے فوق ممکن نہیں۔ سنو! ان لغات کو سنو! جو ایک روح ملکوت انسان کی زبان سے ادا ہوئے اور خدا کا وہ کلام کہلائے حقیقتاً آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں شب و روز کے اختلاف میں۔ ان کشتیوں میں جو دریاؤں میں لوگوں کو نفع پہنچانے کے لئے چل پھر رہی ہیں۔ اس پانی میں جسے اللہ نے آسمان سے نازل کیا اور زمین کو زندہ کر دیا جبکہ وہ مردہ ہو چکی تھی اور زمین میں ہر قسم کے متحرک جاندار پیدا کر دئے۔ ہواؤں کے چلنے میں۔ بادلوں میں۔ جو زمین و آسمان کے درمیان مسخر ہیں غرض ان تمام اشیا میں ان تمام لوگوں کے لئے نشانیاں موجود ہیں جو صاحبان عقل ہیں۔

کتنے تماشے کی بات ہے اور کیسے تعجب کی بات ہے کہ یہ عالم اور اس کا حسن انتظام امور اتفاقیہ یا مادۂ بے شعور کے حوالہ کر دیا جائے۔ گم گشتگی عقل کا حیرت انگیز منظر اس سے زیادہ کیا ہوگا۔ کہ ایسی چیز کو خدائی کے تخت پر جلوہ گری دی جانے لگی۔ جو حیات سے خالی۔ ادراک سے خالی ارادے سے خالی۔ علم سے خالی، کمالات سے خالی۔ العجب ثم العجب۔ مردہ حیات بخش سمجھا جاتا ہے۔ جہل محض منبع علم و ادراک بنتا ہے۔ نقص محض کمالات کا مصدر مانا جاتا ہے اور فقیر محض کے ذمے جود و عطا کے اتہام لگائے جاتے ہیں۔ یہ وہ گروہ ہے جسے اپنی عقل پر ناز ہے۔ اپنے فلسفہ پر ناز ہے۔ اپنی حکمت پر ناز ہے۔

کہیں قوتِ قہریہ کے آثار عجیب رنگ سے ظاہر ہوتے ہیں سب کچھ ہوا۔ لیکن کوئی اتنی جرأت نہ کر سکا کہ اس تمام انتظام

کائنات کو اپنی ذات سے منسوب کرے۔ مجبوراً دوسرے کے حوالے کرنا پڑا۔ یہ اور بات ہے کہ عقلی کابوس میں گرفتار ہوکر اسے ایک چیز کے حوالے کرنا چاہا جو شعور و ادراک سے قطعاً خالی ہے۔ حالانکہ نظام عالم پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ میرا خالق علیم ہے حکیم ہے۔ حیّ ہے۔ مدرک ہے۔ مرید ہے۔ غرض تمام صفات کمال کا وہی مبدء ہے۔ اگر خالق عالم میں یہ کمالات نہ ہوتے تو عالم میں ان کا وجود کیونکر پایا جاتا۔

دلائل وجودیہ

افی اللہ شک فاطر السموات والارض

اس میں شک وشبہ نہیں کہ اس کی ذاتِ مقدس دلائل و براہین کی احتیاج سے قطعاً بری ہے۔ تمام دلائل اپنے وجود میں اس کے محتاج ہیں۔ پھر وہ خود ان دلائل کا محتاج کس طرح قرار پا سکے گا۔ علاوہ ازیں دلائل و براہین کی ضرورت وہاں پڑتی ہے جہاں کوئی امر مشکوک و مشتبہ سامنے آجائے۔ لیکن یہاں تو کوئی ایسی بات ہی سامنے نہیں۔ شک۔ اور اللہ کے بارے میں شک؟ جس نے زمین و آسمان کو پیدا کر دیا۔ ایک ایک ذرہ جس کی ہستی کی خبر دے رہا ہے۔

لیکن باوجود اس کے یہ امر جس قدر روشن ہے اسی قدر یہ پوشیدہ ہوتا جاتا ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ کشف حجاب کے لئے کچھ روشنی ڈالی جائے اور وہ طریقہ استعمال کیا جائے جس پر چلنے کے لئے معمولی عقلیں بھی تیار ہو سکیں۔ اور اس طریقہ کو تا بدہ

استعمال نہ کیا جائے جس کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہوں جنھوں نے ان فنون کی تعلیم پائی ہے جو ایسے استدلالات میں استعمال کئے جاتے ہیں و قلیل ما ہم۔ لیکن اصل یہ ہے کہ کوئی طریقہ ہو ہمیشہ ان لوگوں کو لئے مفید ہوتا ہے جو قلب صافی لے کر اس میدان میں اترتے ہیں

(۱) حکیم ربانی علی ابن ابیطالبؑ سے پوچھا گیا کہ آپ نے اپنے پروردگار کو کیونکر پہچانا فرمایا کہ عزم کی شکست اور ارادے کی نقض نے مجھے بتا دیا اس لئے کہ جب میں نے کوئی ارادہ کیا تو با اوقات ایک شے میرے اور میرے ارادے کے درمیان حائل ہو گئی۔ اسی طرح جب میں نے کوئی عزم کیا تو قضا و قدر نے میرے عزم کی مخالفت کی اس سے مجھے معلوم ہو گیا کہ مدبر کوئی اور ہے اور وہ مجھ سے اعلیٰ ہے۔

(۲) ایک عارف سے دلیلِ وجودِ پروردگار دریافت کی گئی اس نے جواب دیا کہ قلوب پر کچھ ایسی واردات کا ورود ہوتا ہے کہ نفس جن کی تکذیب سے عاجز رہتا ہے۔

(۳) ایک عرب کا مشہور قول ہے کہ اونٹ کی مینگنی اونٹ کے وجود پر دلالت کرتی ہے اور نقشِ قدم کسی جانے والے کے وجود کی خبر دیتے ہیں۔ پس یہ برجوں والا آسمان اور نشیب و فراز والی زمین کیا یہ دونوں صانع خبیر کے وجود پر دلالت نہیں کرتے۔

(۴) ایک عالم نے اپنے بیٹے کو وصیت کرتے ہوئے کہا: میں نے اکثر علمائے اسلام کو دیکھا ہے اور سنا ہے مگر انھوں نے ان لوگوں کے لئے وہ راہ نہایت تنگ کر دی ہے جسے خدا و رسول نے سہل گردانا

تھا یعنی اپنے مولا اور مالک دین و دنیا کی معرفت۔
بیٹا! خدا کی پرانی کتابیں اور قرآن مجید دلائل و تنبیہات سے
مملو ہیں اور بتا رہی ہیں کہ حادثات کا محدث۔ تغیرات کا متغیر کرنے
والا۔ اوقات کا بدلنے والا ضرور کوئی ہے۔ دلائل کا جو طریقہ
ان کتابوں میں پایا جاتا ہے وہی علوم انبیا اور علوم خاتم انبیا
میں پایا جاتا ہے۔ عہد اوّل میں علماء اسلام کا بھی یہی طریقہ تھا اور
آئمہ معصومین میں سے آخری بزرگوار کی غیبت کے زمانے سے
پہلے یہی طریقہ استعمال ہوتا تھا۔
بیٹا! یہ کس قدر روشن طریقہ ہے دیکھ تو اپنی نسبت یقینی طور
سے جانتا ہے اور اس میں ہرگز کوئی اشکال نہیں کہ تو نے نہ اپنے
جسم کو پیدا کیا نہ اپنی روح کو نہ اپنی زندگی کو نہ اپنی عقل کو۔
اسی طرح یہ آرزوئیں یہ احوال ہر شے کے لئے ایک مدت معین
ان میں سے کوئی شے تیرے اختیار سے صادر نہیں ہوئی اور پھر
ان چیزوں کو نہ تیرے ماں باپ نے پیدا کیا ہے اور نہ اُن
ہستیوں نے جن کے اصلاب و ارحام میں منتقل ہوتا ہوا تو آیا ہے
کیونکہ تو یقیناً جانتا ہے کہ وہ لوگ بھی ان مقامات میں عاجز تھے
اور اگر ان مہمات پر انہیں قدرت ہوتی تو پھر ان کی آرزوئیں
اور اُن کی مرادیں کبھی ان سے قطع نہ ہوتیں اور وہ موت کے
پنجہ میں گرفتار نہ ہوتے۔ ان تمام امور پر نظر کرتے ہوئے اب
یہی کہنا پڑے گا کہ اس واحد یکتا نے اس موجودات کو پیدا کیا
ہے جس کی ذات میں تجدّد و تغیر و انقلاب کا امکان نہیں۔ اور

اب تو مجبور ہے اس امر پر کہ صفات کمال خداوند عالم کو تسلیم کرے۔ اسی واسطے عقول صریحہ اور افہام صحیحہ کی کھلی ہوئی شہادت نے تمام لوگوں کو اس امر پر متفق کر دیا کہ وہ صانع کی تصدیق کریں۔ چنانچہ تمام لوگ اس خالق و فاطر کا اقرار کر رہے ہیں۔ ہاں اختلاف اگر ہے تو اس کی ماہیت۔ اور حقیقۃ ذات وصفات کے متعلق۔

دیکھو اور غور کرو! خداوند عالم نے میرے وجود میں عجیب و غریب حکمتیں مضمر رکھی ہیں جنھیں اہل عقل ادراک کرتے ہیں۔ اس نے مجھے جواہر و اعراض و عقل و نفس و روح سے مرکب کیا۔ اب اگر تم اپنے جواہر سے سوال کرو جن سے میری صورت مرکب ہوئی ہے کہ آیا میری پیدائش و فطرت میں ان کا کوئی حصہ ہے یعنی انھوں نے مجھے پیدا کیا ہے تو انھیں عجز و فقر کا اقرار کرتے ہوئے پاؤ گے اور وہ بزبان حال فریاد کریں گے کہ اگر ہم میں یہ قدرت ہوتی تو اس قدر حادثات و تغیرات و انقلابات ہم پر طاری نہ ہوتے۔ وہ اعتراف کریں گے کہ ان تدبیروں میں قطعاً ان کا کوئی حصہ نہیں ہے بلکہ انہیں اس ترکیب کی نہ کیفیت معلوم ہے نہ اُن مفردات کی تعداد اور نہ اُن کا وزن جو اس ترکیب میں آکر جمع ہوئے ہیں لہذا یہی سوال اگر تم اعراض سے کرو گے تو وہ جواب دیں گے کہ ہم تو جواہر سے زیادہ ضعیف ہیں۔ کیونکہ ہم انھیں کی فرع ہیں اور ان سے بھی زیادہ فقیر اور محتاج۔ اسی طرح اگر تم میری عقل۔ میری روح اور میرے نفس سے یہی سوال کرو تو وہ متفقاً

کہیں گے کہ اے شخص تو خوب جانتا ہے کہ ہم ہیں سے کسی کو نسیان کے سبب سے ضعف لاحق ہوتا ہے۔ کسی کو موت کے سبب سے کسی کو ذلت و رسوائی تباہ کرتی ہے۔ پس ہم تو سب کے سب اس کے ماتحت ہیں جو ہمارا غیر ہے وہ اپنے ارادے کے موافق جو نقصان سے کمال اور کمال سے نقصان کی طرف گردش دیتا ہے اور زمانے کی گردشوں کے ساتھ ساتھ حسب مشیت خود ہمیں پلٹاتا رہتا ہے۔ اب بزبان حال واقعی جب تم نے اس امر کی تحقیق کرلی اور جان لیا کہ جواہر ہوں یا اعراض۔ عقول ہوں یا ارواح و نفوس سب کے سب متفقاً عجز و افتقار میں مساوی ہیں تو اب تجھے لامحالا ماننا پڑے گا کہ ہم سب کے لئے ایک فاطر ہے۔ خالق ہے۔ جو ہمارے عجز و افتقار سے منزہ اور پاکیزہ ہے تغیرات و انقلابات و تقلبات سے بری ہے۔ اور اگر اس کے کمال پر بھی نقصان کا زوال ظاہری ہوتا تو وہ بھی ہماری طرح دوسرے کا محتاج قرار پاتا۔

(۵) بمذاق فلسفیانہ وجود واجب پر دلیل واضح یہ ہے کہ کہ اگر مستغنی بالذات کا وجود نہ ہو تو مستغنی بالغیر کا وجود بھی پایا نہیں جا سکتا اور اس صورت میں کوئی موجود بھی نہ پایا جائے گا۔ توضیح اس کی یہ ہے کہ پہلے ہم وجود کی عقلی طور پر دو قسمیں قرار دیتے ہیں (۱) کامل بالذات یعنی ایک ایسا وجود جسے اپنے کمالات حاصل کرنے کے لئے کسی دوسرے وجود کی ضرورت نہیں اور نفس وجود چونکہ خود کمال ہے۔ لہذا اپنے وجود

میں بھی وہ کسی کا محتاج نہ ہوگا۔ اس کا نام کامل بالذات اور مستغنی بالذات ہے (۲) کامل بالغیر یہ وہ وجود ہے جس کے کل کمالات دوسرے سے حاصل ہوتے ہیں۔ اور اسی کو مستغنی بالغیر کہتے ہیں اس تقسیم کے بعد خود سمجھ لو کہ وجود (۲) ہرگز نہیں پایا جا سکتا جب تک وجود نمبر (۱) تسلیم نہ کیا جائے کیونکہ ہر چیز کی نسبت ہم سوال کریں گے آیا وہ اپنے کمالات میں کسی دوسرے کی محتاج ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہے اور اس کا محتاج ہونا بدلائل قطعیہ ثابت ہے تو فبہا ہمارا مطلب حاصل ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ عالم محسوس اور عالم معقول میں کسی شے کی نسبت عدم احتیاج کا فتوے صادر نہیں ہو سکتا۔ خیر۔ اور اگر وہ شئے کسی دوسرے کی محتاج ہے تو پھر اس محتاج الیہ کی نسبت بھی سوال قائم ہو جائے گا۔ یہ سوال ختم نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ کسی ایک ذات کا وجود تسلیم نہ کر لیا جائے جو اپنے وجود اور کمالات وجود میں قطعاً کسی کی محتاج نہ ہو اور اگر ہم ایسی ذات کو تسلیم نہ کریں اور تسلسل کا سلسلہ قائم رکھیں تو پھر چاہئے کہ کسی شے کا وجود نہ ہو

مثلاً (ا) کا وجود (ب) پر موقوف ہے تو جب تک (ب) کا وجود نہ ہو اس وقت تک (ا) کا عالم وجود میں آنا محال۔ لہذا (ا) کو حرف غلط سمجھ کر کاٹ دیجئے اور آگے بڑھ جائیے۔ آگے بڑھ کر (ب) کا وجود (ج) پر موقوف ہے پس (ب) کو بھی قلمزن فرمائیے جب تک کہ (ج) کا وجود نہ ہو۔ اب حضرت (ج) بارگاہ (د) کی منت کش ہے۔ لہذا اسے بھی مرتبہٗ وجود سے ساقط کرنا

پڑے گا جب تک کہ (د) کا وجود نہو اسی پر قیاس کرتے چلے جایئے پس یا تو کسی ایسی چیز کا پتہ بتایئے جس کا وجود کسی دوسرے وجود پر موقوف نہ ہو ورنہ کسی شئے کا وجود بھی عقلاً پایا جانا نہ چاہیئے لیکن اشیاء کا وجود پایا جاتا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ ایک علت العلل اور مسبب الاسباب موجود ہے اور بغیر اس کے کوئی شئے بھی جلوہ ریز نہیں ہو سکتی اسی لئے کہا جاتا ہے کہ جب تک غنی بالذات اور کامل بالذات کا موجود نہو اس وقت تک غنی بالغیر یا کامل بالغیر کا پایا جانا محال ہے۔

اس محال عقلی کی حقیقت تسلسل کی حالت میں تو آپنے ملاحظہ کرلی اب دوسری صورت بھی دیکھ لیجئے اور یوں کہئے کہ (ا) کا وجود (ب) پر موقوف ہے۔ (ب) اپنے وجود میں (ج) کی محتاج ہے (ج) منت کش (د) ہے اور (د) پھر حضرت (ا) کی زیر بار احسان ہے کیا کبھی کوئی عاقل ایسے چکر کو قبول کر سکتا ہے۔ اسی کو اصطلاح میں دور کہتے ہیں اور اس کا ماننے والا گھن چکر کہلاتا ہے۔

دوستو! حقیقت یہی ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ احتیاج کا دامن پھیلائے ہوئے سرنگوں ہے واللہ الغنی و انتم الفقراء۔

(۷) میرے دوستو! واقعہ یہ ہے کہ وجود صانع کو لوگ نظری قرار دیتے ہیں۔ یعنی بڑی غور و فکر اور فلسفیانہ دلیلوں کے بغیر اس کا وجود مانا نہیں جا سکتا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کا وجود بالکل بدیہی ہے اور ادنیٰ تامل اس کے بارے میں کافی۔ ہم فضول حیرت زدہ ہو رہے ہیں یہ تو ایک فطری چیز ہے۔ اس کا اقرار تو فطرت

انسانی کا ایک جزو ہے۔ مادیات کے حجاب میں اس شمع کی لَو ہمیں نظر نہیں آتی۔ لیکن جس وقت مصائب و شدائد کی ہوائیں ان حجابوں کو دور کر دیتی ہیں اس وقت اس شمع کی روشنی میں انسان قدم بڑھاتا ہے اور اس وقت جبلت انسانی ایسے وجود کی طرف متوجہ ہوتی ہے جو تمام اسباب کا سبب اور کل مشکلات کا حل کر دینے والا ہے اور لطف یہ ہے کہ یہ توجہ کرنے والا اس طرف التفات بھی نہیں کرتا کہ میں کدھر جا رہا ہوں کس طرف جا رہا ہوں اُف رے بیخبری۔

یا ایہا الانسان انک کادح الی ربک کدحاً فملاقیہ

اے انسان تو اپنے رب کی طرف چل رہا ہے پوری کوشش کے ساتھ چل رہا ہے تو اس سے ضرور ملاقی ہوگا۔

صادق آل محمد صلوات اللہ علیہم نے اسی بارے میں سائل سے فرمایا کہ تو کبھی کشتی میں سوار ہوا ہے اس نے کہا کہ ہاں! فرمایا کہ اس سفر میں کبھی ایسا واقعہ بھی پیش آیا ہے کہ اس وقت نہ کشتی نجات دے سکتی ہو اور نہ تیراکی سے کچھ فائدہ متصور ہو! عرض کیا بیشک! ارشاد ہوا کہ اس وقت تیرا قلب اس امر سے متعلق ہوا ہے؟ کہ ایک چیز ایسی ہے جو اس گرداب سے بچا سکتی ہے؟ اس نے عرض کیا کہ ہاں۔ فرمایا وہی اللہ ہے وہی نجات دینے پر قادر ہے جبکہ کوئی نجات دینے والا نہ ہو وہی فریادرس ہے جبکہ کوئی فریادرس نہ ہو۔

(۸) ایک عارف سے پوچھا گیا کہ وجود صانع پر کیا دلیل ہے اس نے جواب دیا لقد غنی الصباح عن المصباح چراغ کی

روشنی سے صبح بالکل بے نیاز اور غنی ہے۔ مطلب ظاہر ہے کہ جس طرح نظارہ صبح کے لئے چراغ کی ضرورت نہیں اسی طرح وجود صانع بھی کسی دلیل کا محتاج نہیں ہے۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب

اس بیان میں کسی صاحب ہوش کو شبہہ نہیں ہو سکتا کہ اقرار صانع فطرت انسانی کا جزو ہے۔ اس میں ودیعت ہے۔ وہ مروح الارواح ہے۔ اسی لئے اُس کے وجود کا زبان سے اقرار کر لینا کافی سمجھا گیا ہے اور انسان اس امر پر مکلف نہیں کیا گیا کہ دلائل فلسفیہ ومنطقیہ کی بنا پر اس کے وجود کا قائل اور مقر ہو جس طرح ہر انسان ذی ہوش جانتا ہے کہ آگ اک جلانے والی چیز ہے اور اس سوز آتش کے لئے دلیل قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسی لئے انبیا علیہم السلام اس پر مامور تھے کہ منکر خالق کو بروقت تسلط فوراً قتل کر دیا جائے۔ کیونکہ ایسا شخص ایک امر ضروری کا منکر ہے اور اسے اس لئے زمین پر چلنے کا کوئی حق نہیں۔ ہاں تعمق واستدلال جو اس مقام میں استعمال کیا جاتا ہے وہ زیادتی بصیرت کے لئے ہو یا منکرین کی تردید کے واسطے۔ ورنہ اصل امران باتوں سے غنی و بے نیاز ہے۔

(۹) لیکن تماشا تو یہ ہے کہ اقرار وجود صانع جس قدر ضروری اور بدیہی ہے اسی قدر مبہم بھی ہے۔ تمامی موجودات میں وجود حقیقی اسی کے واسطے ہو۔ لیکن اسی کے وجود سے شدت کے ساتھ انکار ہو رہا ہے۔ آؤ ذرا اس کے اسباب پر نظر ڈالیں۔ جب کسی شخص کو لکھتا ہوا دیکھتے ہیں تو محض اس کے ہاتھ کی حرکت سے ہمیں شعور ہو جاتا

ہے کہ وہ صاحب حیات بھی ہے - علم بھی رکھتا ہے - اس میں قدرت کی بھی شان ہے - لیکن باوجود اس کے بھی ہم اس کی صفات باطنی کا معائنہ نہیں کر سکتے اور نہیں بتا سکتے کہ اس میں صفت غضب کس انداز پر ہے - صفت شہوت کا اس میں کیا رنگ ہے - اب دیکھو وہ امر جو ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں اس میں ظہور و خفا دونوں رنگ کس طرح جلوہ گر ہو گئے ہاں اور بھی تماشہ دیکھو کہ اس کے علم و قدرت کو ہماری آنکھوں نے محسوس نہیں کیا - نہ اس کی حیات کا نظارہ ہوا - فقط ایک گواہ یعنی ہاتھ کی حرکت نے ہمیں امور مندرجہ کے تسلیم کر لینے پر مجبور کر دیا اور یہ چیزیں ہمارے لئے بالکل مقام ظہور میں آگئیں - یہاں سے معلوم ہوا کہ ایک گواہی کی بدولت بہت سی چیزیں تسلیم کی جا سکتی ہیں اور پھر اس طرح کہ محال ان کا ہو اسی کا نام ظہور ہے - پس وہ چیز کہ جس پر کائنات کا ذرہ ذرہ گواہی دے رہا ہو کیا ہم اُسے اظہر موجودات اور تمام اشیاء سے ظاہر تر نہیں مان سکتے ضرور مان سکتے ہیں اور ماننا پڑے گا - پہلے اپنی طرف دیکھو - اعضا کی ترکیب - ہڈیوں کی باہم پیوستگی اعصاب کا استحکام اور تمام جسم میں رگوں کا پھیلا ہوا جال - اُن پر گوشت کا لحاف - پھر جلد کا غلاف پھر بالوں کی نمود - غرض تمام اعضائے ظاہری و باہمی کہہ رہے ہیں اور ہم بالیقین جان رہے ہیں کہ یہ امور خود بخود واقع نہیں ہو گئے - جس طرح ہم یقیناً جانتے ہیں کہ کاتب کا ہاتھ خود بخود حرکت نہیں کرتا - اسی طرح عالم کی ہر شئے - خواہ وہ حواس ظاہری سے متعلق ہو یا حواس

باطنی سے۔ معقول ہو یا محسوس حاضر ہو یا غائب۔ بلکہ خود عقل اور جملہ حواس۔ غرض تمام کائنات اسی کے گواہوں سے لبریز ہے اور اتنی گواہیوں کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس کا وجود انتہائی ظہور لئے ہوئے ہو۔ اب تو ظہور کی شدت میں کلام نہیں ہو سکتا۔ مگر مقام لطف یہ ہے کہ اسی ظہور کی شدت نے اسی عظمت وجلالت ظہور نے عقلوں کو مدہوش کر دیا۔ اور ان مدہوشیوں کا نتیجہ انکار کی صورت میں نمودار ہو گیا۔

سنو! ہماری عقلیں جب کسی امر کا انکار کرتی ہیں تو اس کے دو سبب ہوا کرتے ہیں۔ اول یہ کہ وہ شے فی نفسہ نہایت مخفی ہو اور کسی طرح اس تک رسائی نہ ہو سکے۔ یہ سبب بالکل ظاہر ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ وہ شے کمال ظہور کی حامل ہو اور اس درجہ اس کا ظہور ہو جس سے فوق کوئی درجہ ممکن نہیں۔ پس ایسی شئے کے ادراک سے بھی عقلیں عاجز رہ جاتی ہیں اور اس عجز کا نتیجہ انکار ہو جاتا ہے۔

دیکھو! خفاش رات کو تو دیکھتی ہے۔ لیکن دن کو اُسے کچھ نظر نہیں آتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ دن کا ظہور اپنے پورے کمال پر ہے اور ادھر اس کی بصر ضعیف ہے وہ اس ظہور کی برداشت نہیں کر سکتی اور جب تک دن کی روشنی کے ساتھ ظلمت کی آمیزش نہ ہو اور ظہور کی شدت میں کمی نہ ہو اس وقت تک کچھ نظر نہیں آ سکتا۔

بالکل ہماری حالت خفاش کی سی ہے۔ ہماری عقلیں ضعیف ہیں جمالِ الوہیت کی تابش سے کائنات لبریز ہے۔ چاروں طرف نور

ہی نور پھیل رہا ہے - عالم ملک و ملکوت کا ایک ایک ذرہ ذرہ اس کے نور سے منور ہے پس یہ ہے وہ شدت ظہور جس نے اُسے عقلوں سے پوشیدہ کر دیا - یہاں تک کہ ایسی عقلیں اس کے انکار پر آمادہ ہو گئیں

سبحان من احتجب باشراق نورہ و اختفی عن البصائر و الابصار بظہورہ -

پاک ہے وہ ذات مقدس جو اپنے نور کی درخشندگی کے سبب سے حجاب میں ہے اور اپنے ظہور کے سبب بصائر اور ابصار سے مخفی -

اے تو مخفی در ظہور خویشتن
وے رُخت پنہاں بنور خویشتن

ایک حکیم کا قول ہے ان اللہ سبحانہ ظاہر لم یغب قط والعالم غائب لم یظہر قط و الناس فی ہذہ المسئلۃ علی عکس الصواب یعنی بیشک خداوند عالم ظاہر ہے وہ کبھی غائب نہیں ہوا اور عالم (ماسوی اللہ) ایسا غائب ہے جو کبھی ظاہر نہیں ہوا - لیکن لوگوں کا یہ حال ہے کہ وہ اس مسئلہ میں الٹی بات کہے چلے جا رہے ہیں یعنی ظاہر کو غائب سمجھ رہے ہیں اور غائب کو ظاہر یہ بالکل سچی بات ہے جو شے بذات خود کوئی وجود نہ رکھتی ہو بلکہ اس کا قیام دوسرے کے سبب سے ہو تو اس قیام کو عقلاً قیام نہیں کہتے سورج پر کتنا ہی بادل چلا جائے - لیکن اس کے آثار کو نہیں روک نہیں سکتا - پس گرد و غبار ممکنات شمس وجود حقیقی کو چھپا سکے نا ممکن - کمزور عقلیں اس گرد و غبار میں اٹک جاتی ہیں اور قوی البصر ان حجابوں کی مطلق پروا نہیں کرتے وہ انہیں چاک کرتے ہوئے آن

ربوبیت والوہیت کی شعاعوں کی جلوہ ریزیاں دیکھتے ہیں۔
شدت ظہور سے۔ شان خفا کی نمود پر ہرگز متعجب ہونا چاہئے
یہ ایک حکیمانہ اصول ہے کہ ہر شے کی کامل معرفت اس کی ضد سے
ہوا کرتی ہے۔ تعرف الاشیاء باضدادھا مشہور جملہ ہے۔
اس اصول کی توضیح یہ ہے کہ کسی شے کی معرفت کے لئے ہمارے پاس
آخری مقام یہ ہے کہ ہم اسے آنکھوں سے دیکھیں یا کانوں سے سنیں یا
ہاتھوں سے چھولیں یا زبان سے چکھ لیں یا ناک سے سونگھ لیں مطلب
یہ کہ حواس خمسہ ظاہری کے میدان عمل کا نام عالم شہادت ہی اور ہر
شے کے ظہور کا یہ آخری عالم ہے۔ اس کے فوق کوئی عالم ظہور نہیں۔
لیکن کیا اس عالم شہادت میں آجانے والی شے کو باوجودیکہ ہم اُسے
حواس ظاہری سے محسوس بھی کر رہے ہوں جان سکتے ہیں
ہرگز نہیں یہ دعوے آپ کو عجیب معلوم ہوگا۔ لیکن ٹھیرئے ابھی
مطلب واضح ہوا جاتا ہے۔ جبز۔ پس ہماری معرفت کا تو یہ حال
کہ کسی شے کو نہیں پہچان سکتے باوجودیکہ عالم شہود میں رونق افزا ہے
اور اُدھر یہ مشکل کہ عالم شہادت انتہائے عوالم ظہور ہے۔ پھر اب سبیل
معرفت کیا ہو؟ پس اس گرہ کشائی کے لئے ایک دوسرا عالم ہے جسے
عالم اضداد کہتے ہیں۔ جو ہر عالم کا جزو ہے۔ اس عالم میں البتہ
ہر چیز کی معرفت نہایت آسان ہے اور بغیر اس کے مشکل اور مشکل تر
دیکھو موت نے حیات کے معنی بیان کئے اور حیات نے موت کے
تاریکی نے روشنی کو سمجھایا اور روشنی نے تاریکی کو۔ ترشی سے
شیرینی کی تمیز ہوئی اور شیرینی سے ترشی کی۔ اگر ضدیت کا وجود نہوتا

تو ان میں سے کسی شے کو بھی ہم پہچان نہ سکتے۔ مثال پر غور کرو سورج جب زمین پر اپنی شعاعیں ڈالتا ہے تو ہم سمجھ لیتے ہیں کہ یہ ایک عارضی شے ہے۔ غروب آفتاب کے ساتھ ہی یہ بھی غائب ہو جائے گی اس کا وجود سورج کے ساتھ ہے اور یہ روشنی سورج کا ہی پرتو ہے۔ لیکن خیال تو کرو اگر سورج ہمیشہ چمکتا رہتا اور کبھی غروب ہوتا تو تو ہم یہی گمان کرتے کہ اجسام محسوسہ میں سوائے ان کے رنگ کے خواہ وہ سیاہ ہوں یا سفید اور کوئی چیز نہیں اس لئے کہ سیاہ چیز میں ہم سیاہی کا معائنہ کرتے ہیں اور سفید میں سفیدی کا۔ لیکن جو شے اس سیاہی اور سفیدی کو ظاہر کرنے والی ہے اس کی طرف توجہ بھی نہیں کرتے۔ حالانکہ پہلی نظر اسی چیز (ضوء آفتاب) پر پڑتی ہے ہاں جب سورج غروب ہوا تاریکی پھیل گئی۔ دونوں حالتوں کا فرق کھل گیا۔ اس وقت ہم سمجھے کہ یہ اجسام کس کی ضو سے روشن تھے۔ پس وجود نور کا علم اس کے عدم سے حاصل ہوا اگر یہ عدم نہ ہوتا تو کبھی ایسے مطلع نہ ہوتے۔ یا ہونے کی توبہ ہزار دقت و مشکل

اس بیان سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ بغیر وجود ضد کسی شے کی معرفت میں کتنی مشکل پیش آتی ہے۔ یہیں سے نتیجہ نکال لیجئے کہ وہ ذات جو خود ظاہر اور دوسری اشیاء کی ظاہر کرنے والی ہے کس قدر شدت ظہور کی حامل ہے۔ حتیٰ کہ ظہور اسی کے لئے ہے اور نہ کوئی اسکی ضد ہے جس سے کچھ فرق محسوس ہوتا۔

لہذا اگر ابہام کی شکل یہاں پیدا ہو گئی تو کوئی تعجب نہیں ہاں اگر عدم و تغیر اس کے لئے ہوتا۔ تو دونوں حالتوں کا فرق

معلوم ہو جاتا گر سمٰوات و ارض منہدم ہو جاتے ۔ ملک و ملکوت کا پتہ نہ ملتا حس و محسوس مفقود ہو جاتے یا ایسا ہوتا کہ کچھ اشیا راس کے ساتھ موجود ہوتیں ۔ یعنی اس کے لئے دلیل بن جاتیں اور کچھ اکسی اور کے لیے ۔ تو اس وقت بھی کچھ شانِ افتراق سے پتہ چلتا ۔ لیکن تمام اشیا ایک ہی انداز پر چل رہی ہیں ۔ اسی کے لئے دلیل ہیں ۔ اسی کے وجود کی شاہد ہیں ۔ اُدھر اس کا وجود ازلی و ابدی ہے ۔ بقائے محض اسی کے لئے ہی ۔ پس لامحالہ شدتِ ظہور نے شانِ خفا پیدا کر دی ۔ ھو الظاھر ھو الباطن کا راز اب کھلا ؎

حجابِ روئے تو ہم روئے تست در ہمہ حال
نہانی از ہمہ عالم ز بسکہ پیدائی

یہ وہ مقام ہے جہاں عقلیں حیراں ۔ افہام قاصر ۔ اذہان سربسجود ۔ قال قائل ؎

جہاں جملہ فروغ نورِ حق داں — حق اندر وے ز پیدائیست پنہاں
خرد را نیست تاب نور آں روئے — برو از بہر او چشم دگر جو
ظہورِ جملہ اشیا بضد است — ولے حق را نہ مانند و نہ ند است
چو نبود ذات حق را ضد و ہمتا — نمیدانم چگونہ دانی او را
اگر خورشید بر یک حال بودے — شعاعِ او بر یک منوال بودے
ندانستے کسے کیں پرتو اوست — نبودے ہیچ فرق از مغز تا پوست
چو نورِ حق ندارد نقل و تحویل — نیابد اندرو تغییر و تبدیل

تو پنداری جہاں خود ہست دائم
بذاتِ خویشتن پیوستہ قائم

لیکن جس شخص کی بصیرت قوی ہے ۔ قلب روشن ہے ۔ مزاج معتدل ہے

اسے ان حجابوں کی پروا نہیں۔ اس کی دقیقہ رس نگاہیں اسی کے ظہور کا مشاہدہ کرتی ہیں۔ وہ اپنے افعال کو اسی کی قدرت کے آثار میں محسوب کرتا ہے۔ اسی کے قبضہ قدرت میں اسیر دیکھتا ہے۔ وہ ان افعال کو کسی شمار میں نہیں لاتا۔ بلکہ اس کے نزدیک وجود اسی کا وجود ہے جس کے سبب سے افعال کا وجود نظر آتا ہے۔ پس جس شخص کی نگاہ اس نقطہ پر جم جاتی ہے وہ ہر فعل میں فاعل کا نظارہ کرتا ہے۔ وہ فعل پر بایں حیثیت توجہ نہیں کرتا کہ وہ آسمان ہے یا زمیں۔ شجر ہے یا حجر۔ بلکہ اسے تو ایک صنعت سمجھتا ہے۔ اسکی نگاہ غیر پر جمتی ہی نہیں۔ جیسے کہ انسان نے کوئی شعر دیکھا یا کتابت پر نظر ڈالی یا کسی تصنیف کا معائنہ کیا تو اس کا یہ نتیجہ نہیں کہ وہ کاغذ پر سیاہی کی روانی دیکھ رہا ہے۔ یا یہ کہ سیاہی کے اجزا پر غور کر رہا ہے۔ بلکہ اس حجاب میں اس کی نگاہ۔ شاعر، کاتب اور مصنف تک رسائی حاصل کر رہی ہے۔ پس ارباب قلوب کے نزدیک یہ تمام کائنات یا صحیفہ فطرت خالق عالم کی ایک بے مثال تصنیف ہے اور اس تصنیف سے مصنف کے کمالات کی شعاعیں نکل نکل کر ضیابخش چشم بصیرت ہو رہی ہیں۔ لیکن کمزور نگاہ والے حسن صورت ظاہری پر ہی ایسے مفتون ہوئے کہ پس پردہ کیا ہے ؟ اس کی مطلق انھیں خبر نہ ہوئی۔ اور لطف یہ کہ اسی طریقہ کی طرف دنیا کو دعوت بھی دے دی چھلکے پر قناعت کی مغز سے ہاتھ اٹھا لیا۔ عبارت کے حسن ظاہری پر مٹے۔ مگر معانی سے غرض نہیں اور پھر اس ظاہر پرستی کا نام حکمت رکھ لیا۔ العجب ثم العجب۔

اب تو آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ اس ذات مقدس کے بارے میں جو نظر

موجودات ہے۔ شک وشبہات کے وجوہ کیا ہیں ۔ مگر ایک اور سبب لطیف پر بھی توجہ کرو۔ وہ یہ کہ کائنات کے تمام محسوسات ومدرکات جو خالق عالم کے لئے شہادت دے رہے ہیں۔ انسان انہیں بچپنے سے دیکھنے کا عادی ہے یہ تمام چیزیں آہستہ آہستہ اُس کے سامنے آتی ہیں اور ادھر وہ اپنی خواہشات میں غرق رہتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ تمام چیزیں طول موانست کے سبب سے اسکی نظر میں کچھ وقیع نہیں رہتیں اور انھیں دیکھ کر کوئی اثر خاص اسکی طبیعت پر طاری نہیں ہوتا ہے لیکن یہ دیکھا جاتا ہے کہ اگر دفعتہً کوئی عجیب وغریب حیوان اس کے سامنے آجائے یا کوئی فعل خارق عادت ظاہر ہو تو بے اختیار اس کی فطرت جاگ اٹھتی ہے اور وہ طبعی طور پر "سبحان اللہ" یا اور کوئی کلمۂ تعریف کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مگر وہ شب وروز اپنے نفس کو اپنے اعضا کو، نیز اور اشیاء کائنات کو برابر دیکھتا رہتا ہے جو قطعی دلیلیں ہیں اور اسے ذرا احساس نہیں ہوتا اس کا سبب کیا ہے؟ وہی طول موانست، ہر وقت ان اشیاء کا پیش نظر رہنا۔ انہماک خواہشات۔ اگر مادرزاد اندھا فرض کرو جو بالغ وعاقل ہو۔ اس کی آنکھوں سے پردہ اٹھا دو دفعتہً اسے زمین وآسمان واشجار واحجار نظر آئیں گے یہ ایسے عجائبات اور وجود خالق پر ایسے گواہ ہونگے جنھیں دیکھتے ہی عجب نہیں جو شدت تعجب سے بیہوش اور مبہوت ہوجائے غرض معرفت خالق کے باب میں لوگوں کی مثال اس دیوانے کی سی ہے جو گدھے پر سوار تھا اور اسی کو تلاش کرتا پھرتا تھا ؎

چندیں ہزار ذرّہ سراسیمہ میدوند ۔ درآفتاب وغافل از آفتاب چیست

بیان سابق سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ اس کا وجود اس قدر روشن اور ظاہر ہے جو محتاج دلیل نہیں۔ ایک تفکر و تامل اس کے لئے کافی ہے اب جو شخص اسی فکر میں مبتلا ہے وجود باری کو نظری (محتاج دلیل) سمجھ کر دلائل کے جال میں اسے الجھانا چاہتا ہے سمجھ لو کہ وہ اس سے دور نکل چکا۔ وہ مجہول مطلق کا متلاشی ہے اور ساری عمر بھی اس روگردانی میں بسر کر دے تو کچھ فائدہ حاصل نہ ہو گا۔

تعجب یہ ہے کہ انسان وجود کا متلاشی ہے جو سامنے موجود ہے مگر فی الحقیقۃ ڈھونڈ رہا ہے عدم کو اور عدم چونکہ عدم ہی ہے لہذا سمجھ میں نہیں آتا اب یہ حیران ہے۔ حالانکہ خود اس کا نفس اس کی فکر اس کا تخیل اس کی ہستی یہ سب فروعات ہستی حقیقی ہیں۔ عجب تماشہ ہے۔

آب ہر سو رواں کہ آب کجاست ۔۔۔ مہر سرگشتہ کا فتاب کجاست
مست پرساں کہ مست را دیدی ۔۔۔ بادہ گو ید کہ گو شراب کجاست

چونکہ وجود خلاق عالمیان ایک بدیہی و فطری چیز ہے جیسا کہ بیان کیا گیا مگر اس کے ساتھ ہی بوجہ شدت ظہور و عدم ضد شان خفا لئے ہوئے ہے۔ اس لئے خدائی کلام میں اس کے وجود پر جو دلیلیں بیان کیگئیں وہ اس رنگ سے بیان کیگئیں ہیں جیسے فطرت سلیمہ پیدا ہو جائے چنانچہ ارشاد ہوا ہے افلاینظرون الی الابل کیف خلقت والی السماء کیف رفعت والی الجبال کیف نصبت کیا لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے اسے کیونکر خلق کیا گیا۔ آسمان پر نگاہ نہیں ڈالتے اسے کیونکر بلندی عطا ہوئی۔ پہاڑوں پر نظر نہیں ڈالتے کیونکر نصب کئے گئے۔ کہیں ارشاد ہوتا ہے یقلب اللہ اللیل والنہار ان فی ذالک لعبرۃ

لا ولی الابصار اللہ ہی رات اور دن کو گردش دیتا ہے بیشک اس گردش میں صاحبان چشم بینا کے لئے عبرتیں ہیں کہیں تنبیہ کی گئی ہے فلینظر الانسان الی طعامہ انا صببنا الماء صبًا ثم شققنا الارض شقًا فانبتنا فیہا حبا وعنبا (الخ) انسان کو چاہیئے کہ اپنے طعام پر غور کرے بیشک ہم نے آسمان سے پانی برسایا، زمین کو شق کر ڈالا اور اسمیں سے دانے اور انگور اگائے کہیں جتایا گیا ہے وفی انفسکم افلا تبصرون ہماری نشانیاں تمہارے نفسوں میں موجود ہیں کیا تم نہیں دیکھتے۔ اولم یکف بربک انہ علے کل شئ شہید کیا تیرے رب کے لئے یہ کافی نہیں کہ وہ ہر شے پر حاضر وناظر ہے۔

بالکل یہی طریقہ استدلال حاملان قرآن کا ہے اور صاحبان علم لدنی اسی طریقہ پر گامزن نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ایک مشہور دہریہ ابن ابی العوجا صادق آل محمد صلوات اللہ علیہم اجمعین کی خدمت میں آیا کرتا تھا۔ ایک دن دوران گفتگو میں بول اٹھا لم احتجب عنہم خالق عالم مخلوق سے محجوب کیوں ہے۔ یہ پردہ داری کس لئے۔ حضرت نے فرمایا ویلک کیف احتجب عنک من اراک قدرتہ فی نفسک نشائک ولم تک وکبرک بعد صغرک وقوتک بعد ضعفک وضعفک بعد قوتک (الحدیث) افسوس ہو تجھ پر۔ اب بھی وہ تجھ سے پردے میں رہا جس نے اپنی قدرتیں تیرے نفس میں تجھے دکھادیں تجھے پیدا کیا جبکہ تو نہ تھا صغر سنی سے تجھ کو کبیر السن بنایا ضعف کے بعد تجھے قوت بخشی قوت کو

بعد تجھے ضعیف کر دیا (الخ) ابن ابی العوجا کہتا ہے کہ آپ نے اس قدر دلائل قدرت بیان کئے کہ میں اُن کے دفعیہ کی جرات نہ کر سکا اور مجھے گمان ہو گیا کہ آج آپ تمام ان اسرار کو منکشف کر دیں گے جو میرے اور اس کے درمیان ہیں یہیں سے من عرف نفسہ فقد عرف ربہ کی شرح بھی سمجھ میں آسکتی ہے یعنی جس نے اپنے نفس کو پہچانا اُس نے اپنے رب کو پہچانا ؎

صفا و روشنی کاندرون خانہ ماست ز عکس چہرہ آں دایۂ یگانہ ماست

خرد کہ بیخبر از کائنات افتادہ است خراب جرعۂ از بادۂ شبانہ ماست

اے بندۂ طبیعت! اے دام مادیات کے گرفتار، اے ہوا و ہوس کے اسیر اے انانیت اور خود ستائی کے شیدا۔ آخر یہ غفلتیں کب تک؟ کہاں تک؟ مجموعۂ کائنات پر غور کر۔ ہر شئے کے استحکام کو دیکھ۔ ہر تدبیر کے انفعال پر نظر دوڑا اور بمستانہ وار کہہ

در ہر چہ بنگرم تو نمودار بودۂ

اے نا نمودہ رخ تو چہ بسیار بودۂ

طریقہ مندرجہ بالا جس کی طرف ارباب بصیرت کو توجہ دلائی جا رہی ہے معرفت خالق عالم کے لئے کس قدر آسانیاں بہم پہنچاتا ہے اسی سے فطرت خوابیدہ بیدار ہوتی ہے اور اسی ہوا سے وہ آگ بھڑک اُٹھتی ہے جو ذرے ذرے میں پوشیدہ ہے۔ جب تک ہم غافل ہیں ہر چیز کو اندھوں کی طرح دیکھ رہے ہیں۔ لیکن غفلت کا پردہ اُٹھتے ہی ہر ایک ذرہ وادی ایمن کی صدائے بازگشت یا شمع طور کو کلیجہ سے لگائے ہوئے نظر آنے لگتا ہے۔

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

لیکن ان آسانیوں کے باوجود اسی مسئلہ میں ایک اور پہلوئے مشکل بھی ہے۔ وہ ایک سد سکندری ہے جس سے ہر ایک عقل جا کر ٹکر کھاتی ہے۔ اس ٹکرانے کی حالت میں کچھ عقلیں تو ایسی ہیں کہ استقلال و ہمت کے ساتھ اِس دیوار آہنی کو بھی اپنا رفیق راہ قرار دے لیتی ہیں اور بعض ایسی ہیں کہ ٹکر کھاتے ہی ہمت کافور۔ استقلال برباد اور آخری نتیجہ یہ کہ انکار انکار۔

اس معمہ کی شرح یہ ہے کہ عالم اور اس کے نظام حکمت آمیز کو دیکھ کر جہاں تک عقل کام کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس عالم کو ایک مدبر اور صانع کی ضرورت ہے۔ جو حی ہو، قادر ہو، علیم ہو، مرید ہو، سمیع ہو بصیر ہو۔ پس خلاصہ معرفت عقل یہی ہے اور اس معرفت کی گویا دو جہتیں اور دو حیثیتیں ہیں۔ ایک حیثیت کا تعلق عالم سے ہے اور اسپر نظر کرتے ہوئے اتنا معلوم ہو جاتا ہے کہ اس عالم کے لئے ایک مدبر بھی چاہئے اور دوسری حیثیت کا تعلق ذاتِ باری سے ہے اس پہلو پر غور کرتے ہوئے جو شئے ہمیں دستیاب ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ چند اسماء جو صفات سے مشتق ہیں معلوم ہو جاتے ہیں اور بس۔

خیال تو کرو کہ اگر کوئی شخص کسی شئے کی نسبت اشارہ کر کے دریافت کرے کہ یہ کیا ہے تو اس کے جواب میں ان اسماء کا ذکر کرنا جو صفات سے مشتق ہوں مفید ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ مثلاً کسی حیوان کی نسبت پوچھا جائے کہ یہ کیا ہے؟ تو جواب

میں یہ کہنا کبھی کافی نہیں ہو سکتا کہ وہ طویل ہے یا عریض ہے یا بصیر ہے۔ اسی طرح پانی کی نسبت سوال کرنے پر یہ بتانا کہ وہ ٹھنڈی چیز ہے اور آگ کی نسبت استفسار کرنے پر یہ کہدینا کہ وہ جلانے والی شے ہے ان میں سے کوئی شے حقیقت و ماہیتِ شے پر روشنی نہیں ڈالتی۔ بلکہ ایسے جوابات کے یہ معنی ہیں کہ پانی یا آگ ایک مبہم چیز ہے جس میں وصف برودت یا حرارت پایا جاتا ہے گویا یہ جوابات ایسے ہیں جن سے سائل کی تشفی نہیں ہو سکتی اور مجیب کی عدم معرفت پر دلالت کرتے ہیں۔ علیٰ ہذا خدا کو جو ہم عالم و قادر کہتے ہیں اس کے یہ معنی نکلتے ہیں کہ ایک شے مبہم ہے جو وصف علم و قدرت سے متصف ہے۔ اسی طرح اگر واجب الوجود کہہ کر اس کی تعریف کریں تو یہ مطلب ہاتھ آتا ہے کہ ایک ایسی شے ہے جو فاعل و مسبب سے مستغنی ہے۔ یہی حالت دیگر اسماء کی سمجھیے۔ اس مقام پر پہنچکر ہر عقل پکار اُٹھے گی کہ کسی شے کی نسبت یہ سوال کرنے پر کہ وہ کیا ہے؟ یہ کہنا کہ وہ مثلاً فاعل ہے کبھی کافی نہ ہوگا۔ عقل کا یہ حکم بھی صحیح ہے اور ادھر میدان معرفت میں مرتبہ الوہیت کے دروازے پر جبہہ سائی کرتے ہوئے سوائے ان اسماء کے اور کچھ ہم نہیں کہہ سکتے۔ دیکھا کس قدر مشکل کا سامنا ہے اور اس حالت پر نظر کرتے ہوئے کیسی الجھن پیدا ہو رہی ہے اسی خلش اور اس الجھن میں گرفتار ہو کر بہت سی عقلیں اس سے انکار کر بیٹھیں۔ لیکن قوی القلب بزرگواروں نے یہاں بھی دامن ہمت ہاتھ سے نہ چھوڑا اور ایک عجیب کلیہ قائم کر دیا۔

العجز عن درک الادراک ادراک تیرے ادراک سے عاجز رہ جانا ہی تیرا ادراک ہے۔ سبحان اللہ عجیب ساحت قدس ہے۔ عجب بارگاہ ہے جسے ہم ہجر کہتے ہیں اس کا نام یہاں وصال ہے جسے ہم لحظہ یہ موت سمجھتے ہیں وہ یہاں آبحیات سے موسوم۔

یہ کلیہ جو قائم ہوا ہے بلا وجہ قائم نہیں ہوا۔ غور کرلو کہ جو اشیاء نہیں حواس سے محسوس ہو رہی ہیں۔ کیا ان کی حقیقت کا پتہ تم چلا سکتے ہو ؟ نہیں ! میرے دوستو نہیں۔ پھر خالق کے معاملے میں یہ کدو کاوش کیوں ؟ یہ خلش کس لیے۔ علم حقیقت شے کے تو یہ معنی بھی ہوتے ہیں کہ ہمارا علم یا ہم اس کو گھیر لیں اس کا احاطہ کر لیں تو کیا مخلوق خالق کا احاطہ کر سکتی ہے لا واللہ اسی لئے ارشاد ہوا لا تفکروا فی ذات اللہ تم ذات خدا میں تفکر نہ کرو۔ ہاں اسکی نعمات کو دیکھو جو شب و روز تم پر برس رہی ہیں ارشاد معصوم ہے۔

لم تجعل للخلق طریقا الی معرفتک الا بالعجز عن معرفتک تو نے سوائے عجز عن المعرفت کے اور کوئی طریقہ ہی معرفت کا مخلوق کے لئے نہیں رکھا۔

اس بیان سے مفہوم ہو چکا ہے کہ پہلوئے الوہیت پر نظر کرتے ہوئے ہمیں اقرار عجز سے ہمکنار ہونا پڑے گا اور اسی اقرار عجز میں انسان کی عبودیت کے راز مضمر ہیں اور سجدۂ عبودیت سے انکار کرنے والا انسان ایک سرکشی ہستی ہے۔ جس سے دنیا کو کسی فلاح کی امید نہ رکھنی چاہیئے۔

واضح ہو کہ معرفت صانع عالم ایک فطری چیز ہے جیسا کہ ہم بیان

کر چکے ہیں اور یہ وہ آگ ہے جس کی چنگاری کو ایک ایک ذرہ اپنے سینے میں دبائے ہوئے ہے۔ لیکن محض اس قناعت پر قناعت کرکے بیٹھنا۔ انسان کے لئے سزاوار نہیں۔ یہ ایک اجمال ہے انسان کے لئے زیبا ہے کہ اس کی تفصیل کرے۔ یہ ایک کجلائی ہوئی چنگاری ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ اسے بھڑکائے۔ یہ ایک شمع ہے جو مادے کے سیاہ فانوس میں پنہاں ہے۔ انسان کو لازم ہے کہ اس فانوس کو عقلی توجہ سے ہٹاکر اس کی روشنی کو پھیلنے کا موقعہ دے۔ یہ ایک تخم ہے جو زمین فطرت میں بو دیا جا چکا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ اسے محبت و اخلاص کے پانی سے سینچے تاکہ یہ بار ور ہو۔ یہی معرفتِ فطریہ کے ذریعہ سے معرفتِ شعوریہ کی راہ طے کی جائے۔ ماسوی اللہ پر نظر دوڑاتے ہوئے معرفتِ شعوریہ کا حاصل ہو۔ یہی اسے حاصل ہو سکتی ہے کیونکہ یہی ایک راہ ہے جو اس کے لئے کشادہ کی گئی ہے۔ ورنہ دوسرے پہلو پر نظر کرتے ہوئے عجز ہی عجز کا سامنا ہے جیسا کہ بیان کیا گیا۔ پس یہی معرفتِ شعوریہ اول دین ہے اسی کو انسان پر واجب گردانا گیا ہے اسی کے سبب سے انسان انسان بنتا ہے۔ اب اسکی حیوانیت انسانیت سے بدل جاتی ہے۔ اب وہ محرم اسرار الٰہی بنتا ہے اب اسے انسانیت کے معنی معلوم ہوتے ہیں فاول الدین معرفۃ اللہ تعالیٰ دین کی پہلی منزل یہی ہے کہ اللہ کی معرفت حاصل کی جائے اور اس معرفت کا کمال یہ ہے کہ عارف اسے واحد و یگانہ تسلیم کرے اور چار و ناچار طرف سے نگاہ پھیر کر بہ صدق دل زبان پر

جاری کرے لا الٰہ الا ھو اس کے سوا کوئی خدا نہیں - وہی یگانہ ہے وہی واحد بالذات ہے - اس وحدت کی کنہ ہرگز معلوم نہیں ہو سکتی - اس کو وحدت مخلوقیہ سے کوئی تعلق نہیں - یہی وحدت پکار رہی ہے کہ عبادت میں یکتائی مدنظر ہے - کیونکہ حقیقت عبادت یہی ہے کہ وہ ذات جو قائم بالذات ہے اس کی قیومیت کا حق ادا ہو - پس اس ذات واحد و یگانہ کے سوا اور کون معبود ہو سکتا ہے اس کے سوا جس قدر بھی خود ساختہ معبود ہیں سب باطل -

قل یا ایھا الکافرون لا اعبد ما تعبدون کہدے اے رسول کہ اے گروہ کفار جن چیزوں کو تم پوجتے ہو میں تو ان کی پرستش نہیں کرتا -

حکیم ربانی کی زبان سے اس وحدت کے معنی بھی سن لو - تا کہ معلوم ہو جائے کہ وحدت الہٰی سے کیا مراد ہے -

روز جنگ جمل ایک اعرابی امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا کیا آپ کہتے ہیں کہ خدا واحد ہے ؟ لوگوں نے اس پر ہجوم کر لیا اور کہا تجھے نہیں معلوم کہ امیر المومنین اس وقت کیسے کام میں مشغول ہیں - حضرت نے فرمایا اسے چھوڑ دو - یہی تو وہ شے ہے جس کی بابت ہم اس قوم سے جھگڑا کر رہے ہیں - پھر فرمایا اے اعرابی سن واحد کی چار قسمیں ہیں دو خدا کے لئے جائز نہیں اور دو قسمیں ثابت ہیں - پس اگر کوئی شخص خدا کے لئے وحدت عددی خیال کرے - یعنی اسے ایسا واحد سمجھے جس کے بعد تثنیہ (دو) ہوا کرتا ہے جیسا کہ اعداد کا قاعدہ ہے تو

یہ وحدت خدا کیلئے باطل ہے کیا تو نہیں دیکھتا کہ جن لوگوں نے خدا کو ثالث ثلثہ (تین میں کا ایک کہا) تو خدا نے ان کی تکفیر کر دی اسی طرح اگر اسے واحد کہا جائے اور وہ وحدت مراد لی جائے جو نوع کو جنس کے مقابلے میں حاصل ہوتی ہے (جیسا کہ ہم انسان کی نسبت کہدیں کہ وہ جنس حیوانی میں سے ایک نوع ہے) تو یہ بھی خدا کے لئے جائز نہیں اس لئے کہ یہ تشبیہ ہے اور خدا کی ذات اس سے بزرگ و برتر۔ اب وہ وجہیں جو خدا کے لئے ثابت ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) اس معنی سے اسے واحد کہا جائے کہ اشیا میں سے کوئی شے اس کے مشابہ نہیں بیشک ہمارا پروردگار ایسا ہی ہے۔

(۲) واحد کے یہ معنی لئے جائیں کہ نہ وجود میں اسکی تقسیم ہو سکتی ہے نہ عقل و وہم میں۔ بے شک پروردگار بزرگ کی یہی شان ہے ہم خدا پرست جو خدا کو واحد و یگانہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں یہ کوئی دیوانگی نہیں ہے۔ بلکہ عقل سلیم ہمیں سوائے نقطۂ وحدت کے دوسرے پہلو پر جانے ہی نہیں دیتی اس لئے نظام عالم گواہی دے رہا ہے کہ اس کا منتظم اور مدبر انتہائے حدِ کمال پر واقع ہے۔ بلکہ وہی سرچشمہ کمال ہے یہ اسی کے کمالات کی شعاعیں ہیں یہ اسی کی حسن آفرینیاں ہیں کہ مٹی کی تصویروں پر بھی ہر شئے کو جی جاہتا ہے۔ اس سے بھی قطع نظر کرو اپنی فطرت پر نظر ڈالو۔ کیا تم جویائے کمال نہیں ہو۔ کیا تم کمال کے متلاشی نہیں۔ ضرور ہو بھلا کوئی دنیا میں ایسا شخص ہے جو کمال کو محبوب نہ رکھے۔ یہی

وہ محبوبیت کمال ہے جو تمہیں سر چشمۂ حسن کی طرف کھینچے لے جا رہی ہے۔ میرے دوستو! یہ کمال اگر معمولی سا بھی غور کر لو تو معلوم ہو جائیگا کہ یکتائی میں ہی نظر آیا کرتا ہے نہ کہ دوئی میں۔ جہاں دوئی پیدا ہوئی دونوں کا کمال تشریف لے گیا یہ عجب دلچسپ فلسفہ ہے میر کہتا ہے

بستر کس جگہ تھیں تجھ میں اتنی خودنما شکلیں
یہ حسنِ اتفاق۔ آئینہ تیرے روبرو ٹوٹا

بہترین تخیل ہے۔ بہترین شاعری ہے شاعر نے معشوق کے سامنے آئینہ ٹوٹتے دیکھا ایک شکل کی متعدد شکلیں پیدا ہو گئیں۔ اس تعددِ اشکال وصور سے معشوق کو شرمندہ کرنے کا پہلو نکل آیا کہ اب دعوے یکتائی نہ کرنا۔ تجھ سے بہت سے خود نما موجود ہیں۔ لیکن اگر معشوق جواب دے کہ دیوانے اس تعدد سے میری یکتائی پر کیا حرف؟ میں ایک ہی ہوں جو مختلف آئینوں میں جلوہ گر ہوں۔ یہ لے میں چلا۔ اب دیکھوں یہ بہت سی شکلیں کہاں جاتی ہیں ؎

جام گو نہ گونہ در مجلس شرابے بیش نیست
گرچہ بسیار اند انجم آفتابے بیش نیست

لہٰذا میرے دوستو۔ کمال ہمیشہ یکتائی کا پابند ہے حکماء کا مقولہ ہے ان الکامل من لا نظیر لہ کامل وہی ہے جس کی کوئی نظیر نہو۔ اور قدامت بھی ایک کمال ہے۔ لہٰذا قدیم بھی بے نظیر اور ایک ہی سمجھو۔ دو چار دس میں نہیں ہو سکتے۔ پس خالق عالم جو منبع کمال ہے۔ تمام کمالات اسی کمال ازلی کی شعاعیں ہیں وہ ایک ہی ہے کوئی اسکا شریک وسہیم نہیں شھد اللہ انہ لا الٰہ الا ھو

اسلامی تعلیم کا لب لباب اس مسئلہ میں یہ ہے کہ ہم ایسی ذات کو خالق مانتے ہیں جو نقائص و عیوب سے مبرا ہو یہی وہ مرحلہ ہے جس کے طے نہ کرنے سے مشکلات کا سامنا ہوتا ہے اور بعض دوسرے مذاہب ناقص کو بھی خدا ماننے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن یقین کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ فطرت صحیحہ کا راز اسلامی تعلیم میں پنہاں ہے کتنی قیامت کی بات ہے کہ اگر کسی شخص کی نسبت کہا جائے کہ وہ ناقص ہے تو خواہ مخواہ اسے بُرا معلوم ہوتا ہے حالانکہ وہ فی الحقیقۃ ناقص ہی لیکن اس بُرا معلوم ہونے کا راز یہ ہے کہ فطرت نقص کو دوست نہیں رکھتی۔

ہم اس مسئلہ پر زیادہ توضیح کے ساتھ بحث کرتے ہیں۔ پہلے نقصان وکمال کے معنی دیکھ لینے چاہئیں۔ پھر یہ مسئلہ واضح ہو جائے گا۔

ہم جب کسی شے کی نسبت یہ دعوے کرتے ہیں کہ فلاں شے کامل ہے تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اس شے میں یہ کمال موجود ہے۔ اور جب کسی شے کو ناقص کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس میں فلاں کمال موجود نہیں۔ اس طرح گویا کمال و نقصان کے معنی ہستی و نیستی یا یوں کہو کہ وجود و عدم کی طرف رجوع کر جاتے ہیں اور کمال سے ہماری مراد وجود ہے اور نقصان سے عدم۔ اب ہم تین حالتیں فرض کرتے ہیں اور یہ تقسیم عقلی تقسیم ہے۔

(۱) کمال ہی کمال جس میں قطعاً شائبہ نقصان نہیں۔

(۲) نقصان ہی نقصان جس میں مطلق کمال نہیں

(۳) کچھ کمال کی شان بھی ہے اور کچھ نقصان کا بھی لگاؤ ہے۔

ان تینوں صورتوں میں سے دیکھ لینا چاہیے کہ ہم پر کون سی صورت صادق آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ دوسری صورت عدم محض کی ہے جس کا وجود خارج میں پایا ہی نہیں جا سکتا۔ اسی طرح پہلی شکل بھی ہم اپنے لیے تجویز نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ کمال محض کی شان ہم سے مفقود ہے لامحالہ ہمارے لئے تیسری حالت رہ جاتی ہے یعنی کمال اور کچھ نقصان یہی حالت امکانی حالت کہلاتی ہے اور یہی ممکن کی شان ہے۔ اب لامحالہ شکل اول واجب الوجود کے لئے قرار پائے گی۔

ایک بات اس مقام پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ افعال ہمیشہ فرع ذات ہیں اور ایک کے وجود کے لئے جو حکم جاری ہوگا وہی دوسرے کے لئے بھی ہو جائے گا بادی النظر میں یوں سمجھ لو کہ میری ذات کی عزو محتاج اسباب ہے۔ پس اسی طرح میرے افعال بھی محتاج اسباب ہیں۔ اور اگر میری ذات محتاج اسباب نہ ہوتی تو میرے افعال کو بھی اسباب کی احتیاج نہ تھی اس لئے کہ ہر فرع اپنی اصل کی طرف رجوع کرتی ہے

اس کلیہ سے وہ توہم بیجا باطل ہو جاتا ہے کہ خالق عالم اپنی صنعت میں مادے کا محتاج ہے۔ اس لئے کہ صنعت ایک فعل ہے۔ پس جو اپنے فعل میں مادے کا محتاج ہے چاہیے کہ اپنی ذات میں بھی محتاج مادہ ہو۔ حالانکہ اس امر کو یہ توہمین بھی تسلیم نہیں کرتے۔ یہیں سے بالبداہتہ معلوم ہو گیا کہ خالق عالم اظہار صنعت میں مادے کا محتاج نہیں ہے۔ بلکہ وہ خالق مادہ ہے۔ ہاں

اس کا عکس یوں کہہ سکتے ہیں کہ مادہ اپنے تنوعات میں صانع کا محتاج ہے جو یقینی ہے اور ان لوگوں کا مسلمہ ہے۔ پس اس بنا پر ضروری ہے کہ وہ اپنی ذات میں بھی صانع کا محتاج ہو جیسا کہ یقیناً ہے۔

اگر غور کرو گے تو یہ دلیل قدامت مادہ کے باطل کرنے کے لئے کافی ہے ایصال مطلوب کے لئے وافی۔ پھر بظاہر اصطلاحات فلسفیہ ومنطقیہ سے خالی۔

اگر ہم یہ بھی تسلیم کر لیں کہ اس میں دوئی کا جادہ ہے تو اسکے ساتھ ہی عقل حکم لگا دے گی کہ اندریں صورت ایک ایسے امر کی ضرورت ہے جو ایک کو دوسرے سے ممتاز کر دے اسی کو مایہ الامتیاز کہتے ہیں اور بغیر اس کے دوئی کبھی متحقق نہیں ہو سکتی اب وہ شئے جس کو مایہ الاشتراک کہتے ہیں جو دو نو فردوں میں مشترک ہوا کرتی ہے اس کو تو مایہ الامتیاز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے کہ ان دونوں کے احکام مختلف ہیں۔ پس لامحالہ مایہ الامتیاز کسی عرض غریب کو قرار دیا جائے گا اور اندریں صورت ایک ایسے مخصص (تخصیص کر دینے والے) کی ضرورت ہو گی جو ایک کے مقابلے میں دوسرے کو اس عرض کے ساتھ مخصوص کر دے اور مخصص اصل میں خالق ہوا کرتا ہے۔ لہذا ان دونوں کے واسطے ایک اور خالق کی ضرورت ہے یا اس مقام پر یہ کہا جائے گا کہ ان دونوں میں سے ہر ایک نے اپنے آپ کو یا اپنے شریک و سہیم کو کسی امر مایہ الامتیاز (جو عرض غریب خارج از ذات مخصوص کیا ہے

تو اس صورت میں تخصیص سے قبل دو متعین بلا مخصص قرار پائیں گے۔ جو محال ہے قلم یکن لہ کفوا احد۔

یہ دلیل اگر غور کرو گے تو نہایت محکم پائی جائے گی۔ واقفان فن تو اس دلیل سے اچھی طرح واقف ہیں ان کو سمجھانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن جو احباب اس میدان میں نہیں آئے۔ ان کے لئے اس کی توضیح کی جاتی ہے۔

دیکھو زید و عمر دو انسان ہیں ان میں ایک چیز ایسی ہے جس نے ان دونوں کو ایک احاطے میں گھیر رکھا ہے۔ جس کا نام انسانیت ہے اس کے لحاظ سے یہ دونوں ایک ہیں۔ اب جدائی اور دوئی جو ان میں محسوس ہوتی ہے وہ اس امر مشترک کے ذریعے سے نہیں ہوتی اس نے تو دونوں کی یکتائی کا فتوے دیا ہے بلکہ وہ جدا کرنے والی شے (ما بہ الامتیاز) اور ہی ہے۔ مثلاً ان کا جسم، رنگ، طول وعرض وغیرہ۔ اور یہ ایسی چیزیں ہیں جو ذات شخص میں داخل نہیں بلکہ اس سے خارج ہیں۔ اور عرض غریب کہلاتی ہیں۔ پس زید و عمر کو ان اعراض سے جو مخصوص کیا گیا ہے تو اس کا مخصص کون ہے؟ آیا وہ خود ہیں یا کوئی اور؟ اگر کوئی اور ہے تو فبہا وہی خالق یکتا ہے اور اگر یہ خود ہیں تو عقل تجویز کرتی ہے۔ ایک وقت میں دو متعین بلا مخصص رہ جاتے ہیں جو محال ہے کیونکہ یہ ایک دوسرے کو مخصوص تو جب کریں گے جبکہ خود مخصوص ہو لیں۔

یہ دلیل بھی اہل نظر کے نزدیک ایک محکم دلیل ہے اور

فائدہ دے سکتی ہے بشرطیکہ تعصب وعناد سے انسان خالی الذہن ہو۔ علاوہ اس بیان کے اہل فن اسی دلیل میں سے اور دلیلیں بھی اخذ کر سکتے ہیں

ایک اور آسان اور مفید مطلب دلیل پیش کی جاتی ہے وہ یہ کہ حالت دوئی میں ایک کا اثر بعینہٖ دوسرے کا اثر قرار پائیگا اس لیے کہ وہ دونوں حقیقت یعنی تمامیت کمال و وجود میں متفق ہیں۔ پس اگر کسی اثر یا فعل کو ایک کے ساتھ مخصوص کیا جائے اور دوسرے کا لحاظ نہو تو ترجیح بلا مرجح لازم آتی ہے جس کے بطلان پر دلائل قائم ہو چکے ہیں اور اگر یہ کہیں کہ دونو سے وہ فعل صادر ہوا تو اس حالت میں فعل واحد کا جو ایک شخص سے صادر ہونا چاہیے دو ہستیوں سے صادر ہونا لازم آتا ہے۔ جو محال ہے یعنی یہ مقررہ اصول ہے کہ ایک معلول کے لیے دو علت مستقلہ قرار نہیں پا سکتیں پس جب یہ دونو باتیں باطل ٹھیریں تو کہنا چاہیے لوکان فیہما آلھۃ الا اللہ لفسدتا

اگر زمین و آسمان میں کئی خدا ہوتے تو بیشک ارض وسما فاسد ہو جاتے۔

ان مختصر سطروں کو جو لکھی جا رہی ہیں۔ ہم نے استدلال کی چاشنی سے بھی خالی نہیں رکھا۔ لیکن التماس یہ ہے۔ کہ آخر امہات سفلیہ کی خدمتگزاری انسان کب تک کرے گا آباء علویہ سے کب تک روگردانی ہے سہ

بود محبوس طفل شیر خوارہ

بہ نزد مادر اندر گاہوارہ
چو گشتہ بالغ و مرد سفر شد
اگر مرد است ہمراہ پدر شد

آغوش مادر اسی وقت تک موزوں ہے جب تک عقل و تمیز کے پروں سے اڑنے کی قوت نہیں آتی۔ لیکن ہوش سنبھالتے ہی انسان باپ کی طرف رخ رکھتا ہے حضرت عیسیٰ کا یہ قول۔ انی اسافر الی ابی اسی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ نصاریٰ نے غلطی سے سچ مچ کا بیٹا ہی سمجھ بیٹھے۔ مقصد یہ کہ عام طبیعت کی گرفتاری اور فطرت سلیمہ سے دستبرداری ہیں شک و شبہات کے جال میں الجھا رہی ہے ورنہ۔

وفی کل شئے لہ آیۃ
تدل علے انہ واحد

ہر چیز میں اس کی شان موجود ہے جو اس کی وحدت پر دلالت کر رہی ہے۔ خود اپنی ہستی کو دیکھو اپنے اعضا کی ترکیب و تالیف پر نظر ڈالو۔ باہمی اختلاف موجود ہے۔ ایک دوسرے سے ممتاز ہیں لیکن ایک دوسرے کو نفع پہنچانے کیلئے تیار اور سب کے سب ایک لڑی کے موتی۔ جس کی شکستگی موت کی مترادف ہے۔ یہ امر صاف ظاہر کرتا ہے کہ ان کا مدبر۔ ان کی قوتوں کو اختلال و زوال سے روکنے والا ایک ہی ہے اور یہ سب ایک ہی مبدا کی طرف سر جھکا رہے ہیں۔ اسی طرح تمام موجودات کا ایک دوسرے کے ساتھ نہایت حکیمانہ اصولوں کے ساتھ

منظم ہوتا ظاہر کر رہا ہے کہ ان کا مبدع - ان کا مدبر - عالم
کی اس زنجیر کو خستگی سے بچانے والا واحد حقیقی ہے۔
یمسک السموات والارض ان تزولا
وہی زمین و آسمان کو تھامے ہوئے ہے - وہی انہیں زوال
سے بچا رہا ہے۔ اگر اس کے ساتھ کوئی اور بھی صانع و خالق
ہوتا تو البتہ صناعی میں کچھ نہ کچھ امتیاز کی شان ہوتی۔
ایک کی صنعت کا کچھ اور رنگ ہوتا - دوسرے کی صنعت کچھ اور
کبھی یہ موجودہ ارتباط باقی نہ رہتا اور تمام عالم اختلال و فساد
کی نذر ہو جاتا - ہر ایک صانع اپنی اپنی صنعت پر نازاں ہوتا -
اور ایک دوسرے پر تعلی چاہتا سبحان اللہ عما یصفون۔
حضرت صادق علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ توحید صانع پر کیا
دلیل ہے فرمایا اتصال التدبیر و تمام الصنع - یعنی اشیائے
عالم کے خلق و تنظیم و ترتیب کے لئے تدابیر مختلفہ کی ضرورت
ہے لیکن ہر ایک تدبیر کی کڑی دوسری کے ساتھ وابستہ
ہے اور اسی طرح ہر صنعت الہی اپنے کمال پر فائز ہو رہی ہے
اگر اتصال تدبیر نہ ہوتا تو کوئی صنعت اپنے شباب کی بہار
نہ دکھا سکتی -
امیر المومنین علی ابن ابیطالب علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے
فرزند امام حسن علیہ السلام کو وصیت کرتے ہوئے ارشاد
فرمایا -
بیٹا تمہیں جان لینا چاہیئے کہ اگر کوئی تمہارے رب کا شریک

ہوتا تو اس کے رسول بھی تم تک آتے۔ اس کے ملک اور اس کی سلطنت کے آثار بھی تم کو نظر آتے اس کے افعال اور اس کی صفات کی بھی تمہیں معرفت ہوتی۔ لیکن وہ وحدہ لا شریک ہے اس کے ملک میں کوئی اسکی ضد نہیں اور نہ اُس کے لیے زوال و اضمحلال ہے۔

یہ نصیحت اتنی زبردست اور بہتر دلیل ہے۔ جس کے مافوق اہل ذوق کے لیے متصور نہیں۔ مگر دیکھنے کو چشم بینا اور سننے کے لیے گوش شنوا کی ضرورت ہے۔ جس کا اس زمانے میں قحط پڑا ہوا ہے۔

بارالہا میں ان سطروں کو ختم کرتا ہوں اور میرا ایمان ہے کہ تو کسی دلیل و برہان کا محتاج نہیں۔

کیف یستدل علیک بما ھو فی وجودہ مفتقر الیک

اُس شے سے تیرے لیے کیونکر دلیل لائی جا سکتی ہے۔ جو خود اپنے وجود میں تیری محتاج اور تیرے در کی فقیر ہے۔ اگر معاذ اللہ تیرے وجود کا اثبات اسی دلیل پر موقوف ہی تو ایک وقت ضرور ایسا تھا کہ یہ موجود نہ تھی تو پھر کیا تو بھی اس وقت موجود نہ تھا تعالے اللہ عن ذالک علواً کبیراً تو زمین و آسمان کا مالک دلیل و برہان کا خالق انت اینت الاین وانت کیفیت الکیف تو نے ہی مکان بنایا۔ تو نے ہی کیفیات کو خلق کیا وجود تیرا وجود باقی لاموجود۔

فلا موجود الا اللہ۔

طبیعات نے۔گرد و غبار نے۔ابھی اس شے کی طرف بھی متوجہ نہ ہونے دیا جو مجھ میں بول رہی ہے ؎

حجاب چہرۂ جاں می شود غبار تنم
چہ خوش بود کہ ازیں چہرہ پردہ برفگنم

پھر وہ نے جس کے قبضہ میں بولنے والی شے ہے اسکی طرف کہاں توجہ ہوئی۔

الٰہی فی تلاطمت امواج قاموس قدرتک فکل شئے فی قبضۃ قدرتک اسیر و ذالک علیک سھل یسیر

خداوندا تیرے دریائے قدرت کی موجیں متلاطم ہیں ہر شئے تیرے قبضہ قدرت میں اسیر ہے اور ان کا اسیر کر لینا تیرے لئے نہایت آسان اور اسہل۔ہاں ان سطروں سے اگر کچھ مقصد ہے تو یہ کہ تیری مخلوق کے دل میں تیرا شوق پیدا ہو۔شوق تو موجود ہے۔لیکن یہ آگ عالم طبیعت کی سرد مہری سے ٹھنڈی ہوئی جاتی ہے۔چاہتا ہوں کہ یہ بھڑک اُٹھے اور کاش یہ چند سطریں یادکش کا کام دے جائیں۔

فلک الحمد فی الآخرۃ والاولیٰ

تمت بالخیر

جلوۂ توحید

کی جھلک آپ نے صفحہ قرطاس پر ملاحظہ فرمائی۔ یہ ان ضروری مباحث میں سے پہلی ضرورت محسوسہ تھی جس کی تشنگی عام طور پر محسوس ہو رہی تھی اور جس کی ابتدائی منزل عقلیہ و فلسفیہ و منطقیہ کو حضرت مولانا حکیم سید ذاکر حسین صاحب قبلہ کے قلم بلاغت رقم نے مختصراً ان صفحات پر جلوہ دیا ہے لیکن نبض شناسانِ ملت نے جن دیگر ضروری مباحث کا پرتو کاغذ پر جلوہ فگن دیکھنا چاہا ہے وہ مختصر رسائل کی شکل میں ابھی بصورت مسودہ محفوظ ہیں جن کی تشریح و اسماء صفحۂ ثانیۂ سلسلہ پر مندرج ہے جو حضرات چاہتے ہیں کہ ہر رسالہ طبع ہوتے ہی ان کی خدمت میں روانہ کردیا جائے وہ اپنے اسمائے گرامی اور تا مہائے نامی آج ہی درج کرادیں۔

واللہ علےٰ من اتبع الھدیٰ

ابو القلم منیر زیدی مالک مطبع یوسفی دہلی

رسائل زیر طبع

فلسفہ دعا - بحث عدل - حقیقت معجزہ - رد تناسخ - اثبات تقیہ - التکلیف والعبادہ

اہل علم و ذوق پر یہ امر واضح ہے کہ دعا - عدل - معجزہ - تناسخ - تقیہ اور تکلیف و عبادت کیسے ضروری مباحث ہیں اور ان کے صاف ہو جانے میں کسقدر ہدایت مضمر ہے - مثال میں پہلی چیز دعا کو لے لیجئے - یہ جاننا کس قدر ضروری ہے کہ دعا کے معنی کیا ہیں - اس کا محل کیا ہے دعا کس طرح کرنی چاہئے - نتائج دعا کے لئے کیا یقین رکھنا لازمی ہے **فلسفہ دعا** میں ان تمام امور کی تشریح اور توضیح اس طرح کی گئی ہے کہ پھر اس امر میں کوئی ضرورت استفسار و تامل باقی نہیں رہتی۔

یہ امر واضح رہے کہ ہر رسالہ نہایت ضروری بحث پر شامل ہے اس لئے تمام واقفان ملت و احباب مومنین تک پہنچانا اور اس خبر کا ذکر کرنا فرائض تبلیغ میں سے ایک اہم ذمہ داری ہے - مذہب کا ہر فرد جو شرعی کی حیثیت سے ثواب عظیم میں داخل ہونا چاہے - ہر اپنے واقف تک اطلاع کر دے۔

منیجر مطبع یوسفی دھلی

غلط نامہ

چونکہ یہ رسالہ نہایت ضروری مبحث پر ہے اس لئے اس میں معمولی سی معمولی چھپائی کی غلطی بھی صحیح کردیا گیا ہے۔ لہذا پہلے صحت فرماکر ملاحظہ شروع فرمائیں۔

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲	۱	نعات	نغمات	۱۲	۱۸	باہمی	باطنی
″	۲	دہ کلام	کلام	۱۴	۱۸	بادل چلاجائے	بادل چھاجائے
″	۲۰	کہیں	لیکن	۱۷	۱۵	یریک	بیک
۳	۳	ایک چیز	ایک ایسی چیز	۱۹	۱۵	اگر	ایک
۴	۶	ارادے کی	ارادے کے	۲۰	۳	ایک تفکر	ایک ادنیٰ تفکر
۶	۱۷	او	اور	″	۱۶	فطرت حلیمہ بیدار	فطرت سلیمہ بیدار
″	۱۸	لہذا	علیٰ ہذا	۲۵	۸	معنی بھی	معنی
۷	۴	جو	×	″	۱۰	لاولتہ	لاواللہ
″	۱۲	تقبیات	تقلبات	۲۵	۱۳	ملحق	للخلق
″	۱۴	ظاہری	طاری	″	۱۶	ہوچکا ہو	ہوچکا
۸	۶	سوال کرینگی	سوال کرینگے کہ	″	۱۹	سرکشی	سرکش
″	۱۷	عام وجود	عالم وجود	۲۶	۲	استقناعت پر	اسپر
۱۱	۱۳	اسی اس لئے	اس لئے اسے	۲۸	۱۵	اس لئے	اس لئے کہ
۱۲	۵	موجود ہیں	موجود ہی	۲۹	۵	تجھ ہیں	تجھ سے
″	۱۱	محال انکا ہو	محال انکا نہو	۳۱	۶	یعنی کمال	یعنی کچھ کمال

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۱	۱۲	کی عزو	کی نمود	۳۴	۲۰	روگردانی ہے	روگردانی ہوگی
"	۱۹	یہ تو متو ہیں	یہ متو ہیں	"	۱۸	پاشنی	چاشنی
"	۲۱	یاکہ	بلکہ	۳۷	۲	طبیعاتی	طبیعات کے
۳۲	۶	کاجی ہے	کافی ہے تو	"	۷	توجہ ہوئی	توجہ ہوتی
"	۲۱	خارج از ذات	خارج از ذات ہے تو	"	۸	قاموش	قاموس
۳۳	۱۷	تو عقل تجویز کرتی ہے		۳۸	۱۲	اہل	سہل

ترجمۂ اردو نہج البلاغت
مخزن فصاحت

کلام ربانی کے بعد اگر کسی کلام بلاغت نظام کو تمام تصانیف انسانی پر فوق حاصل ہے تو وہ یہی کتاب مستطاب ہے جو جناب امیر المومنین علی ابن ابیطالب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خطبات ملفوظات، فرامین، وصایا اور کلام کا مجموعہ ہے۔ ترجمہ میں خصوصیت سے کوشش کی گئی ہے کہ بجائے ترجمہ کے بذات خود ایک مستقل کتاب معلوم ہو۔ نیز نہایت دلفریب۔ طباعت دیدہ زیب لسان اللہ کے قابل ایک مطالعہ کی چیز کو اس سے عالی ترکیبیں۔ اس کتاب کو اول سے آخر تک پڑھ جائیے معلوم ہی نہ ہوگا کہ یہ اصل کتاب کا لفظی ترجمہ ہے بلکہ خود ہی ایک کتاب کی شان نظر آتی ہے۔ مترجمہ جناب مولانا مولوی السید ذاکر حسین صاحب قبلہ مدظلہ قیمت بایں ہمہ خوبی صرف چار روپیہ (للعہ) علاوہ محصول ڈاک

مہتمم مطبع یوسفی
دہلی